شکیل عادل زادہ

بے راگی کا راگ

جانے کب کسی صاحبِ دل نے یہ فرمودہ ایجاد کیا تھا کہ موسیقی رُوح کی غذا ہے۔ اب یہ کلیہ اتنا رواج پاچکا ہے کہ زبان زدِ خاص و عام ہے۔ شاید اس لیے کہ اس سے بہتر، جامع اور بلیغ تعریف اب تک ممکن نہ ہوسکی ہے۔ موسیقی کی تحریک و ترغیب اور حمایت و وکالت کے لیے ہر چند ایسے کسی قولِ فیصل کی ضرورت نہیں تھی کہ موسیقی بجائے خود اپنی دلیل، اپنا جواز ہے۔ تخریف و انکار کے لیے البتہ ایسے سند آفریں اقوال اور اعتبار آمیز کلیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ موسیقی کوئی معذرت نہیں ہے کہ وہ تو انسان کے اندر موجود ہے۔ ہر شخص بہ قدرِ حوصلہ اور بہ حدِ استطاعت ایک موسیقار ہے۔ بے شک کبھی کبھی کچھ ذی نفس ثابت و سالم حالت میں وجود میں نہیں آتے یا یوں کہیے کہ معیاری انسانی نمونوں کے مطابق! کبھی کوئی بینائی کی محرومی لے کے آتا ہے کبھی کوئی گویائی کی، اور کبھی رُوح کے بغیر بھی لوگ اس عالمِ رنگ و بو میں وارد ہو جاتے ہیں۔ روئے زمین پر بے روح اجسام کی مثالیں، گو شاذ و نادر ہیں مگر موجود ہیں۔ انہیں موسیقی کے نشاستے سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ آسانی کے لیے ان کا شمار انسانوں سے مشابہت رکھنے والی کسی اور مخلوق میں کر لینا چاہیے۔ موسیقی کا تعلق تو خالصتاً ان انسانوں سے ہے جو اپنے میکانکی جسم کے باوجود رُوح سے عاری نہیں۔

جسم کا میکنزم غذا کے بغیر قائم نہیں رہتا۔ مذکورہ، مروّجہ کلیے کی رُو سے رُوح کو بھی کسی غذا کی ضرورت پڑتی ہے۔ بیان میں سقم کا کوئی پہلو ہے تو یہی کہ جسم کی طرح رُوح کو بھی کوئی غذائی وظیفہ لازم ہے۔ اس عاجز کی رائے میں رُوح اس بیرونی اعانت و امداد کے بغیر بھی قائم رہتی ہے۔ اسے صبح و شام کی فیڈنگ کے تسلسل و تواتر سے سروکار نہیں۔ نادیدہ رُوح کی غذا بھی اکثر و بیشتر غیر مادّی ہوتی ہے۔ فطرت نے روح کی غذا کے لیے بہت سے پھول، رنگ، خوشبو، پرندے، نیلا آسمان، بدلیاں، آبشار، چاند اور دریا وغیرہ جیسے بے شمار مظاہر تخلیق کیے ہیں۔ رُوح ان سے اپنی توفیق کے مطابق حظّ حاصل کرتی ہے۔ صرف موسیقی ہی رُوح کی غذا نہیں، یہ تو من جملہ کا ایک حصہ ہے اور بہت بڑا طلسم ہے۔ جن کے ہاں پھولوں، رنگوں، خوشبو، نیلے آسمان اور بدلیوں سے کوئی ہل چل، حرکت اور لطافت پیدا نہیں ہوتی، ان کا موسیقی سے بھی کوئی علاقہ نہیں ہوتا، کیوں کہ فطرت کے یہ سارے جاں گداز، جاں فزا مظاہر موسیقی کے محرک و موئد ہیں۔ موسیقی انھی سے عبارت ہے، انھی کا پرتو ہے اور انھی سے کشید کی جاتی ہے۔ یہ غذا کی بات موسیقی جیسی لطیف چیز کے ساتھ اچھی نہیں لگتی، ثقالت پیدا کرتی ہے۔ انسان کا سب سے بڑا المیہ ہی غالباً یہ ہے کہ اسے زندگی کے قیام و قرار کے لیے انجن کے ایندھن کی طرح غذا کی ضرورت پڑتی ہے، جب کہ انسان محض انجن نہیں ہے، وہ تو خیال ہے، خواب ہے، احساس ہے۔ وہ تو جانے کیا کچھ اس سے بھی سوا ہے۔ وہ تو رُوح ہے۔ رُوح، جسم کا مابعدالطبیعاتی وجود ہے۔ یہی امتیاز تو اسے دوسری

انواع سے جُدا کرتا ہے۔ غذا چاہے کیسی شکّریں، عنبریں ہو، رُوح کے ریشم کی نرمی اور رُوح کے شیشے کی نازُکی سے اس کی نسبت نہیں بنتی۔ جسم کے مانند، غذا رُوح کی مجبوری نہیں ہے، نہ اسے ہونا چاہیے۔ موسیقی تو ہوتی ہی رُوح کے لیے ہے۔ یہ رُوح کی عادت ہے، رُوح کی جبلّت ہے۔ جو انسانی اجسام، رُوح کے شرف سے ممیز اور روح کے سوز و گداز سے مزیّن ہیں، یہ تو ان کے ہاں خود بہ خود، خودرَو پودے کی طرح پھوٹتی، امڈتی ہے۔ یہ تو رُوح کا لازمہ ہے۔ یہ تو اصل میں رُوح کی پہچان ہے۔ موسیقی تو روح کی شناخت ہے۔ اس سے مراد ہے کہ انسان زندہ و آسودہ ہے اور پورے شعور میں ہے۔ وہ ناتمام نہیں، تمام حواس و ادراک سے مرصّع و مسجّع ہے۔

جناب ایچ اقبال نے موسیقی کے اَسرار و رُموز پر مجھے کچھ لکھنے کا حکم دیا ہے۔ میں عرض کروں کہ میں اس فن کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ راہ چلتے کسی لَے پر جن کے سینے میں حرکت تیز ہو جاتی ہے، موسیقی سے میرا معاملہ بھی اس شخص جیسا ہے۔ میں تو صرف ایچ اقبال کو جانتا ہوں جو میری پسند کے کسی مغنّی یا نغمے کا ذکر سن کے مجھ پر بے تحاشا ہنستے ہیں۔ پہلے میں بھی ان پر ہنستا تھا کہ یہ کون سے ہٹیالے والے ہیں۔ بارے اب یہ وقت بھی آیا کہ انھیں چھیڑنے ستانے کے لیے میں کوئی راگ چھیڑ دیتا ہوں، کسی غیرتِ ناہید کا ذکر کر دیتا ہوں، ان کا چہرہ بگڑ جاتا ہے۔ وہ مجھ سے ہاتھ جوڑ کے استدعا کرتے ہیں کہ خدا کے لیے بس کرو، یا میں یہاں سے اُٹھ جاتا ہوں۔

ایچ اقبال سے میری آشنائی کل کی بات نہیں، میں اسے اس وقت سے جانتا ہوں جب اس کے رخِ زیبا پر روئیدگی شروع ہوئی تھی۔ نقش و نگار کا وہ عجب تیکھا تھا۔ کامنی سا بدن، رنگت شہابی گلابی۔ ایک بار ملنے پر بار بار ملنے کو جی کرے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، میں نے اسے رئیس صاحب کے روزنامہ شیراز کے دفتر میں پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ وہاں آیا ہی پہلی بار تھا۔ اس زمانے میں رئیس صاحب کا یہ دفتر صاحبانِ فنون کے لیے گوشۂ اماں بنا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ وہاں جس کا ذکر ہو گیا، اس کے پیروں میں بیڑی پڑ گئی۔ بہ شرطِ زندگی دوبارہ آمد اس کا مقدر تھی۔ ایچ اقبال بھی وہاں آتا جاتا رہا اور رئیس صاحب کے ایما پر کچھ عرصے کے لیے، جہاں تک میری یادداشت ساتھ دیتی ہے، روزنامہ شیراز سے وابستہ ہو گیا۔ رئیس صاحب کو جولائی ۶۲ء میں اپنے کلیم کے عوض گارڈن ایسٹ میں ایک کوٹھی الاٹ ہو گئی۔ ساری بساط ہی الٹ گئی۔ شیراز تو پہلے ہی بند ہو چکا تھا، شیرازہ بھی بکھر گیا۔ رئیس صاحب نے دفتر بھی لپیٹ دیا۔ وہاں آنے والے سبھی نے جیسے پردہ کر لیا۔ ایچ اقبال بھی روپوش ہو گیا۔ برسوں بعد کسی نے بتایا کہ جاسوسی ناول لکھتا ہے۔ پھر ایک جُگ بعد ربط ضبط کی کوئی صورت پیدا ہوئی تو بالکل ہی بدلا ہوا تھا۔ فلمی ہیرو کی طرح خوب رُو، بانکا، سجیلا، قامت کی کشیدگی نے زیبائی دو آتشہ کر دی تھی۔ شہابی رنگت

پختہ ہو چکی تھی۔ عمر سے زیادہ بُرد بار دکھائی دینے لگا تھا۔ مجھے جاسوسی ناولوں سے ایسا شغف نہیں رہا۔ سچی بات یہ ہے کہ ابنِ صفی کے بعد کوئی دوسرا نام ذہن قبول ہی نہیں کرتا تھا۔ معلوم ہوا کہ ابنِ صفی کے بعد سب سے مقبول نام ایچ اقبال ہی کا ہے۔ اس کی کتاب اِدھر چھپتی ہے، اُدھر لُٹ جاتی ہے۔ اس کی شہرت کا جادو ایسا چمکا ہے کہ بعض ناو ہند اپنے ناول بھی اس کے نام سے منسوب کر دیتے ہیں، چنانچہ اب ہر ناول پہ ایچ اقبال کو اپنی تصویر چھاپنی پڑتی ہے۔ یہ سب کچھ جان کے بڑی مسرت ہوئی تھی، رشک بھی آتا تھا۔ میں نے اس وقت تک اس کا کوئی ناول نہیں پڑھا تھا۔ میں بعد کو بھی نہ پڑھ سکا۔ بس جاسوسی ناولوں کے شائقین کی زبانی سُراغ ملتا رہتا تھا کہ ایچ اقبال کیسے ممتاز قصّہ گو ہیں۔ تڑاتڑ لکھتے ہیں۔ ایک صبح بیٹھتے ہیں تو دوسری صبح تک ناول مکمل ہو جاتا ہے۔ تحریر میں شوخی اور لپک ہے۔ انداز میں سرّیت اور رمزیت ہے۔ کردار تخلیق کرنے میں ملکہ ہے۔ ان دنوں میں بُری طرح اپنے آپ سے نبرد آزما تھا۔ سرِ راہے کبھی ایچ اقبال سے ملاقات ہو جاتی تو مجھے مبارک سلامت کا موقع البتہ مل جاتا۔

میرے اس کے تعلقِ خاطر کا باقاعدہ اِعادہ سب رنگ کے اجراء کے بعد ہوا اور اس کے بعد میں نے ایچ اقبال کی ہمہ جہتی، ہمہ صفتی کو ٹھیک طرح سے جانا۔ دوسرے لفظوں میں مجھے اس کے صوفیانہ اور عاشقانہ تیور قریب سے دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ آوارہ مزاجوں سے میری اچھی بنتی ہے بلکہ میں انہیں تلاش کرتا رہتا ہوں۔ ایچ اقبال کے توسط سے تو میں نے زندگی کے ایک دو ناقابلِ فراموش منظر بھی گزارے۔ سب رنگ کے اجراء کے دو تین سال بعد اسے سب رنگ کی طرز کے ایک پرچے کی ادارت مل گئی۔ ایچ اقبال اس رسالے کے مدیر تو تھے ہی، بانیوں میں بھی ان کا شمار ہوتا تھا۔ میری ان کی تاجرانہ چشمک اور پیشہ ورانہ عداوت کی بنیاد پڑ گئی تھی، لیکن خدا سے بڑا گواہ کون ہوگا، یہ تپش مسابقت کے جذبہ و جوش سے کبھی آگے نہ بڑھی۔ ہم دونوں میں خوب ملاقاتیں ہوتی تھیں، عموماً دسترخوان پہ! یہ دھان پان بلا کا خوش خوراک ہے۔ بسیار خور کبھی نہیں رہا۔ بہ قول شخصے نہایت حلیم الطبع واقع ہوا ہے کہ حلیم سے اسے بڑی رغبت ہے۔ پائے کا ذوق بھی بہت بلند پایا ہے۔ مرچوں بھرا قیمہ، جسے روہیل کھنڈ کی زبان میں مرچ قلیہ کہتے ہیں، اس کے گھر کا خاص مینو ہے۔ گوشت خوری اور مُنہ ماری ابتدا سے ایچ اقبال کا شیوہ رہی ہے۔

دو تین برس بعد اس نے رسالے کی ادارت چھوڑ دی۔ مزاج کا یہ شخص بڑا اَنّی ہے، ہٹ دھرمی کی حد تک۔ زمانہ سازی کی کوشش بڑی کرتا ہے، سلیقہ نہیں ہے۔ ایک دفعہ ہم چند احباب حیدر آباد کے سفر پہ تھے کہ مجھ سے کہنے لگا۔ "میں بھی ایک رسالہ نکالنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا ضرور، مگر یہ بہت جان جوکھوں کا کام ہے۔ کہنے لگا کوئی نام بتاؤ۔ میں نے الف لیلہ تجویز کیا۔ ایچ اقبال نے اسی نام سے اپنا ایک رسالہ جاری کر دیا۔ اس طرح اس نے ایک ایسے کام کی ابتدا کی جس کے نصف کا وہ اہل تھا۔ پرچا نکالنا دو طرح کی مہارت چاہتا ہے۔ ایک ادارت کی، دوسرے تجارت کی۔ لفظوں کی کاری گری، بازی گری میں وہ خوب طاق تھا۔ کاروباری چال بازی اور ہنر مندی میں اسے بڑی غلط خوش فہمی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ کاروبار برداشت، بے حسی اور بے جگری کا کھیل ہے۔ اسی ذیل میں اس نے مُنہ کی کھائی۔ ایک مصنّف نے دس وعدوں کے بعد تصوّف کا مضمون وقت پہ نہیں دیا تو ایچ اقبال خود قلم کاری کرنے بیٹھ گیا۔ تاریخی کہانی بھی ایک وقت میں ڈائجسٹ رسالوں کا جزو ہوا کرتی تھی۔ ایچ اقبال مصنّف کو طرح طرح سے لبھا کے لایا۔ مصنّف نے تیسرے چوتھے مہینے آنا کانی کی تو خود لکھنے لگا۔ ایک تاریخی کہانی، دوسرا تصوّف کا مضمون، ایک سلسلہ وار سرگزشت، کوئی ایک دو اور کہانیاں، تصحیح، سرخیاں، نوٹ، پروف ریڈنگ، مصنّف کو اپنے رسالے کے لیے آمادہ کرنے کی تگ و دو، اداریہ نویسی، آرٹسٹوں کی خوشامد، کاغذ کے لیے مہم جوئی، ایجنٹوں سے داؤ پیچ، خوش نویسوں سے آنکھ مچولی، یہ ساری ناممکنات ہر وہ مدیر اپنے رسالے کے لیے ممکن کرتا ہے جس کے والدین کوئی ترکہ چھوڑے بغیر گزر گئے ہوں۔ سرمایے کے بغیر یہ تماشا آدمی کو آدھا کر دیتا ہے۔ کم و بیش میں بھی اپنے رسالے

کے لیے یہی کرتا تھا۔ میں سب رنگ گزیدہ تھا۔ میں نے بہت ٹوکا۔ جانے کیا سمجھا کہ میرے حال سے عبرت نہ پکڑی، بیمار پڑ گیا۔ میں بھی بہت شاہ خرچ ہوں لیکن آنے والے دنوں کی ناراضی سے کبھی غافل نہیں رہا۔ مجلس بازی مجھے بھی خوب آتی ہے لیکن مجھ میں بہانہ تراشی اور بد اخلاقی کی اچھی صلاحیت ہے۔ ایچ اقبال اور میری بہت سی عادتیں مشترک ہیں، لیکن ترازو میں اس کا پلڑا جھکا ہی رہتا ہے۔ وہ مجھ سے زیادہ جرأت مند، مہم جو، ضدی، بے فکرا، خوش خیال اور غصہ ور ہے۔ مجھ سے زیادہ لکھنے والا ہے۔ یہ میری اس کی مسابقت کی بات نہیں، مقصود کچھ اور ہے۔ میں خود جاننا چاہتا ہوں کہ جاسوسی کہانیوں کا کامیاب مصنّف صد فی صد کہانی کے ایک وینچر میں کیوں ناکام ہو گیا۔ میں نے اسے الف لیلہ کی اجرائی سے منع کیا تھا۔ پھر میں نے کہا کہ اصرار مت کرو، دکان بند کر دو۔ بہتر ہے، جسم کے کچھ بال حفظِ ماتقدم کے لیے اپنے پاس بھی محفوظ رکھو۔ میری بات وہ تین سال پہلے مان لیتا تو تین سال پہلے اتنا شاداب ہو چکا ہوتا۔ الف لیلہ کی بندش کے بعد اس کے ہاں ایک نیا ایچ اقبال طلوع ہوا۔ اس کے جسم میں خون بننے لگا۔ اس کے دست و بازو پھیلنے لگے۔ گالوں پہ شفق پھوٹ پڑی۔ یہ رسالہ اخبار کاری ایسی ہی جاں کاہی کا مشغلہ ہے۔ سو میں سے پچانوے کا خون چوس لیتا ہے۔ سو میں سے پچانوے کو اجیرن کر دیتا ہے۔ بے شماروں کے لیے یہ ایک لت ہے۔ آدمی کل کی امید میں گاڑی کھینچتا رہتا ہے اور عموماً منزل اتنی ہی دور ہوتی جاتی ہے۔ ستم یہ کہ ایک عمر کھپا دینے کے بعد احساس نہیں ہوتا کہ اپنے پُرسانِ حال اور متعلقین پر کیسا ستم ہوتا رہا ہے، شکست کی قبولیت انھیں کتنا سُرخ رُو کر سکتی تھی۔ الف لیلہ کی اشاعت کے دوران ایچ اقبال پر سہاگ کے موسم بھی آئے۔ آواز میں اس کی کبھی کا سوز و گداز تھا۔ ذرا فراغت ملی تو سُر جگانے کی خواہش بھڑکنے لگی۔ باقاعدہ ایک استاد رکھا۔ سُر بادشاہ مہدی حسن کی خدمت میں حاضری دی جو بعد کو یاری و یار باشی میں بدل گئی۔ گھر میں موسیقی کی محفلیں جمنے لگیں۔ ایک دفعہ کسی بین السطوری وجہ سے استاد کا آنا بند ہو گیا تو سنگت کے لیے طبلے کی نقاب ریکارڈ کر لی۔ ٹیپ ریکارڈر کا بٹن آن کر کے چپکے چپکے ریاض کرتا رہا۔ یہ کچھ اسی قسم کا عمل تھا کہ آرٹسٹ نے ذرا حسین، محبّت کی تو کہانیوں کی سرخیاں بھی خود لکھنے لگا۔ اِدھر اُدھر سے تصویریں کاٹ پیٹ اور جوڑ جاڑ کے رسالے کو مصوّر کی کمی سے بے نیاز کر دیا۔

ایچ اقبال نے ناول نگاری کب سے موقوف کر دی تھی۔ الف لیلہ کے بالخیر خاتمے کے بعد اس نے مختلف رسالوں میں کہانیاں لکھ کے زندگی بسری کا عزّت مندانہ، غیرت مندانہ ذریعہ ڈھونڈ لیا۔ اس سارے دورانیے میں موسیقی کی ہوس اس پر طاری رہی۔ مشکل سے مشکل اور مصروف سے مصروف وقت میں ہارمونیم سے اس کا ساتھ نہیں چھوٹا۔ رفتہ رفتہ ایک اعتماد آتا گیا۔ سُنا ہے، دو ایک نجی محفلوں میں بھی شرکت کی ہے لیکن پیشہ ورانہ طور پر نہیں اور آئندہ بھی یقیناً کبھی نہیں۔ موسیقی کے لیے اس کے یہاں وہی احترام ہے جو عاشق کے ہاں اپنے سوزِ نہاں کا ہوتا ہے۔ یہ کتاب اس کے عشق کی غمّاز ہے۔

اصل میں یہ جو حضرت ایچ اقبال ہیں، یہ بڑے حضرت ہیں۔ ان کے چہرے کا ٹھہراؤ بہت منافقانہ ہے۔ یہ اندر سے اتنے ہی متلاطم، بے کل پرندے کے مانند ہیں۔ غصّہ سبھی کو آتا ہے لیکن ان کا غصّہ، الامان! یہ صاحب گھر کی قیمتی چیزوں کی پروا نہیں کرتے۔ لاکھ کا گھر وا پل بھر میں خاک کر دینے کی خوبی ان میں بدرجۂ اتم ہے۔ لطف یہ کہ ایسے کسی سنگین واقعے پر لطف لے لے کے اپنے تدبان کی داستان بھی سب کو سناتے ہیں۔ موسیقی پر مختلف خاندانوں کا اجارہ ہے۔ یہ خانوادے سب کچھ اپنے پاس ہی سینت کے رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ ایچ اقبال کی خوئے ضد ہی تھی کہ انھوں نے کسبِ علم کے لیے ہر طرح کی جتن کی اور گھس بیٹھی چھاپا ماری کر کے اجارہ داروں سے ان کے ہُنر کی ٹوہ لیتے رہے۔ خلاصہ یہ کہ اس صورت میں یہ کتاب وجود میں آئی۔

موسیقی کے ہمیشہ دو قسم کے سامع ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو موسیقی سے گہرا شغف رکھنے کے باوجود بہرے سے اس فن سے ناواقف ہیں اور محض سَر دُھنتے ہیں۔ دوسرے وہ جو موسیقی کی ابجد سے کم و بیش آشنا ہیں اور ...

سمجھنا بھی چاہتے ہیں۔ جہاں بیٹھک کے موسیقی سے لطف اندوز ہونے والوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے اور وہی اس کے متحمل ہوتے ہیں جو تھوڑا بہت موسیقی کا نظام جانتے ہیں۔ اینچ اقبال نے جب مُبادیات سے آگہی کی جستجو کی تو اس پر جیسے نو بہ نو اَسرار منکشف ہوئے۔ اسے معلوم ہوا کہ آگے تو ایک سمندر ہے۔ اس نے جانا کہ نہ جاننے سے جاننے کا لطف کس قدر مسرت انگیز اور حیرت خیز ہے اور کیا ہی اچھا ہو کہ موسیقی کے سچے لطف کے لیے ہر موسیقی نواز کو اس کی مُبادیات بھی آیا کریں۔ موسیقی ہمارے معاشرے میں رچی بسی ہے۔ جو رتبہ اور پسندیدگی موسیقی کو ہمارے ہاں حاصل ہے فنونِ لطیفہ کے کسی اور شعبے کو اس کا عُشرِ عشیر بھی نہیں ہے اور حادثہ یہ ہے کہ موسیقی سے اس کے شیدائی جتنے بے بہرہ ہیں، زندگی میں شامل کسی اور فن سے اس قدر نہیں۔ سبب اس کا غالباً وہی ہے کہ مدعیانِ غنا، نا پرسشِ احوال اور ناقدریٔ زمانہ پہ آنسو تو بہاتے ہیں، موسیقی کے علم کی توسیع واشاعت کے لیے کوئی جنبانی نہیں کرتے۔ نہ کتابیں ہیں نہ درس گاہیں، اکا دکا کہیں کسی شہر میں جو درس گاہیں قائم ہیں، ان کی حالت خاصی دگرگوں ہے۔ سُنا ہے، اساتذہ تین چار داؤ بتا کے شیر خواروں کی چھٹی کر دیتے ہیں اصل نسخۂ کیمیا کے لیے نسب کا اصیل ہونا لازم ہے۔ یہ تو چھوٹ چھات والی بات ہے۔ پھر گلہ ہے کی شکایت ہے، قدر دانوں کی کمی اور ہلا گلا کا سکہ چلنے کی؟

کسی نے کہا تھا کہ یورپ سے ہم ایک چیز میں سدا ممتاز رہیں گے، اپنی موسیقی کی روایت کی وجہ سے۔ کوئی مبالغہ نہیں کہ ہم فنِ موسیقی کے ایک عظیم الشان ورثے کے امین ہیں۔ جس کلاسیکی موسیقی کو ہم چینی زبان سمجھ کے درگزر کر دیتے ہیں وہی موسیقی کی اساس ہے۔ یہ زبان تھوڑی بہت کسی کو آجاتی ہے تو کچھ اسی کو اپنے اس نادرِ روزگار اثاثے کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہوپاتا ہے۔

اینچ اقبال کوئی موسیقار نہیں۔ بڑا ہونا تو دور کی بات ہے، وہ موسیقی کا مُبتدی ہے۔ اس سے پہلے چند جیّد قسم کے فرہادوں نے اپنے اپنے طور پر کام کیا ہے مگر بیان کے ابہام اور اصطلاحات کی پیچیدگیوں کی وجہ سے یہ کام ابتدائی طالبانِ علم کے لیے ایسا بار آور حاصل نہیں رہا۔ اینچ اقبال اس زمانے کا آدمی ہے۔ اس عہد کی زبان اسے آتی ہے اور اس نے کسی رسمی مکتب کے بجائے اپنے گھر بیٹھے اپنی جستجو سے سب کچھ خود جانا اور اخذ کیا ہے۔ سو وہ ایک مُبتدی کی دشواری اچھی طرح سمجھتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک قلم کار ہے اور کہانیاں لکھتا ہے۔ نت نئے کردار وضع کرنا اور ان کی نسبتوں سے زبان اور لہجے تخلیق کرنا اس کا کام ہے۔ اس نے سادہ پیرائے میں موسیقی کی الف بے تے کا درس دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ بہتر طور پر جانتا ہے کہ کون سا پیرایہ اس کی بات کو موسیقی کے ایک عام سامع تک منتقل کر سکتا ہے۔

یہ کتاب موسیقی کی کلید ہے، موسیقی کا قاعدہ، لُغت اور ابتدائی انسائیکلو پیڈیا بھی اور یہ موسیقی کی تمہید بھی ہے، تعارف بھی! اس کی سادگی اسے موسیقی پر لکھی جانے والی دوسری کتابوں سے ممتاز کرتی ہے۔ ہمارے ہاں موضوعات کی کتابوں کی ویسے بھی بڑی کمی ہے اور علمِ موسیقی سے متعلق کتابیں تو انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں۔ ہر کتاب ایک اضافہ ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں، اینچ اقبال کی یہ کتاب علمِ موسیقی میں کوئی اضافہ نہیں لیکن موسیقی پر لکھی جانے والی کتابوں میں بے شک ایک اضافہ ہے اور یہ ایک اور سبب سے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ سُر سبھا کے ایک نووارد، ایک باہر کے آدمی کی طرف سے ہے۔